آب
منظور ہاشمی

آب
منظور ہاشمی
دائرے پبلیکیشنز علیگڑھ

اشاعت : ـــــــــ ۱۹۹۴

کتابت : ـــــــــ شکیل شاہجہانپوری

سرورق : ـــــــــ جمال بدایونی

طباعت : ـــــــــ کلر پرنٹرس، علیگڑھ

تعداد : ـــــــــ پانچ سو

ناشر : ـــــــــ مصنف

قیمت : ـــــــــ چالیس روپیے / دس ڈالر

• ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ
• مکتبہ جامعہ، علی گڑھ، دہلی، بمبئی
• بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
• حسامی بکڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد

انتساب

اپنے پیارے بچوّں
مسعود، شاہد، رخشاں
جاوید، منصور اور یاسمین

کے نام

جو میری بہترین تخلیق

ہیں !!

یہ کتاب
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش، لکھنؤ کے جزوی
مالی تعاون
سے شائع
ہوئی ہے

پیش لفظ

منظور ہاشمی ہمارے دور کے ایک معتبر اور منفرد غزل گو شاعر ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام بہ عنوان 'جا ر ہی ہے منظر عام پر آیا تھا جس میں ایک چونکا دینے والی کیفیت تھی۔ ایک طرح کی دروں بینی اس میں اپنے گرد و پیش کی کائنات سے ہلکی سی ناآسودگی کا احساس بھی تھا۔ اپنے خوابوں، آرزوؤں اور اندیشوں سے چمٹے رہنے کا عزم بھی۔ منظور ہاشمی کم گو ہیں، لیکن وہ اپنے جذبات کی تہذیب اور تطہیر سے غافل نہیں رہے ہیں۔ پیش نظر مجموعے کو جس میں پہلے مجموعے کی کم از کم پانچ غزلیں شامل ہیں۔ مصور کا نقشِ ثانی کہنا چاہیئے۔ یہ ان کی شعری سفر کی دوسری منزل یا پڑاؤ ہے جس میں ان کی انفرادیت اور زیادہ چمک اٹھی ہے اور صیقل شدہ ہے۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ شاید غزل کے موضوعات محدود اور متعین سے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس مروجہ سانچے میں تنوعات پیدا کرنا ریاض بھی چاہتا ہے اور دیدہ وری بھی۔ موضوعات اور موتیف چاہے کتنے ہی فرسودہ کیوں نہ ہوں تنوعات حاصل کرنے کا بیشتر انحصار شاعر کے اپنے شعور اور ادراک پر ہے۔ آج کل انسان جس مخمصے میں گرفتار ہے اس کے اظہار کے لئے وہ جو نئے اور آہنگ اختیار کریگا وہ یقیناً اپنے پیشروؤں سے مختلف ہوگا۔ منظور ہاشمی کا سب سے بڑا امتیاز اور ان کی خوبی، جو اس مجموعے کو پڑھ کر راقم الحروف کے ذہن پر اثر انداز ہوئی وہ ان کی ندرت

احساس ہے۔ وہ اپنے تاثرات کو شعری زبان فراہم کرنے کے لئے جس حسن کارانہ سلیقے سے کام لیتے ہیں اور جس اعتدال اور خود ضبطی سے بھی وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کی اپنی نجی کائنات کا زیروبم گردوپیش کی دنیا سے متصادم نہیں، لیکن ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف سفر کرنے کی آرزو اور اس جستجو کے درمیان وسیع افق پر نظریں جمائے رکھنے کا حوصلہ ان کے یہاں قدم قدم پر پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جذباتیت، وفور اور تندی نہیں ہے۔ وہ توازن اور ٹھہراؤ جو گہرے سمندر کے پانیوں میں مخفی ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں ترصیع یعنی ARTIFICE کا جو عنصر ہے (اور یہ شاعری کا جزو لاینفک ہے اس لئے کہ زندگی کی حقیقتوں کو شعری کائنات میں منتقل کرنے اور انھیں معنویت سے مملو کرنے کا یہی وسیلہ ہے) اس میں غیر ضروری اہتمام و انصرام نہیں ہے۔ اس سے ان کی غزلوں میں ایک کھرا پن پیدا ہوا ہے جو جذبے کی صداقت اور گیرائی کا بھی رہینِ منت ہے۔ جس کائنات کو وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے بار بار دیکھتے اور جس کے حسن کی کشش انہیں رہ رہ کر لبھاتی رہتی ہے۔ اسے وہ ایسے شعری پیکروں اور نشانات کے ذریعہ ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے بادل، کشتی، دریا، پتوار، آکاش، جزیرے، سمندر، دھواں، رنگ و نور، گھاس، شگوفے، در و دیوار، حصار، دروازے، کواڑ وغیرہ۔ رنگ و نور اور تمازتِ حسن کا ایک منفی پہلو بھی ہے اور حسن کے ساتھ ساتھ بدصورتی بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ ان متناقض پہلوؤں کو بھی وہ نظر میں رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار میں جو رکھ رکھاؤ جو بانکپن اور جو میانہ روی تاباں ہے، اسے آپ چاہیں تو ایکطرح کا DEPERSONALIZATION یا ایک طرح کا خود علیحدگی کہہ لیجئے۔ اس میں ایک طرح کی رومانی، شیریں افسردگی بھی پائی جاتی ہے۔ خالص فنی اور لسانیاتی سطح پر اس کا اظہار قرینے یا SYMMETRY کے رنگ اور انداز میں ہوتا ہے۔ منظور ہاشمی کے ہاں جس خود کلامی اور دروں بینی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی طرف شروع ہی میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے ہاں وہ شور و غوغا اور ادعائیت نہیں جو ناپختگی پر ولادت کرتی ہے۔ ندرتِ احساس، خوشگوار لب و لہجہ، اور دل گرفتگی، اور احتجاج کے بجائے جذبات اور ردِ عمل کی ایک

متوازن پیش کش، یہ ہیں منظور ہاشمی کے شیوہ گفتار کے بنیادی اور نمایاں اجزاء اور یہی ان کی شخصیت اور کردار کی چغلی بھی کھاتے ہیں۔ غزلیں جن کے مطلع حسب ذیل ہیں پوری کی پوری نظروں میں کھبنے والی ہیں:

یا شہرِ جنوں ویران ہو گیا ہے
یا وحشی تن آسان ہو گیا ہے

☼

مٹی مٹی سی سہی کچھ نشانیاں تو ہیں
ہمارے بعد ہماری کہانیاں تو ہیں

☼

کبھی کبھی تو وہ اتنے رسائی دیتا ہے
کہ سوچتا ہے تو مجھ کو سنائی دیتا ہے

☼

ایک موہوم سے منظر کی طرح لگتا ہے
دشت اب بچھڑے ہوئے گھر کی طرح لگتا ہے

☼

وہ آس پاس نہیں پھر یہ سلسلہ کیسا
اجاڑ دشت میں خوشبو کا قافلہ کیسا

☼

کٹی پھٹی ہوئی تحریر لے کے آیا تھا
عجب نوشتۂ تقدیر لے کے آیا تھا

☼

عجیب رنگ مرے دھوپ کے دیار میں تھا
شجر کہ خود اپنے ہی سائے کے انتظار میں تھا

☼

کوئی پوچھے تو نہ کہنا کہ ابھی زندہ ہوں
وقت کی کوکھ میں، اک لمحۂ آئندہ ہوں

☼

کہاں کہاں کے ارادے سفر سے پہلے تھے
تمام موڑ مگر اس کے گھر سے پہلے تھے

☼

اور مفرد اشعار تو اتنی تعداد میں ہیں، کہ ان کی نقل کرنا مشکل ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ شوقِ خود نمائی سے مستغنی ہونے کے باوجود منظور ہاشمی اپنے معاصرین میں اچھے سے اچھے غزل گو شعراء سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔ اپنے نئے پن میں روایت کے انحراف کے باوجود ان کے ہاں وہ ناتراشیدگی نہیں ہے جس کا مظاہرہ جدت کے نام پر خاصا عام ہے، لیکن یہ اظہارِ حقیقت کا ایک منفی انداز ہوا۔ مثبت طور پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ تجربے کے کھرے پن پر مستزاد ترسیل و ابلاغ کے وسائل پر جیسی استادانہ قدرت منظور ہاشمی کے حصے میں آئی ہے وہ کمیاب بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی۔

اسلوب احمد انصاری

علیگڈھ
ا۱ اکتوبر ۱۹۹۴ء

حمد

کبھی جو سہل کو دشوار بھی بناتا ہے
وہی تو آگ کو گلزار بھی بناتا ہے

شجر کو تیز ہوا کے سپرد کرتا ہے
اور اس کی شاخ کو تلوار بھی بناتا ہے

وہ کائنات کے سارے طلسم کھولتا ہے
کھلے ہوئے کو پراسرار بھی بناتا ہے

نعت

ظلمت میں روشنی کا سہارا تو آپؐ ہیں
آقا، ہماری صبح کا تارا تو آپؐ ہیں

میں کیا کروں گا، دولت کونین مانگ کر
جو ختم ہی نہ ہو، وہ خزانہ تو آپؐ ہیں

کشتی کا بادباں سے تعلق ضرور ہے
موجوں کے درمیاں کنارا تو آپؐ ہیں

اس روز کوئی دوسرا کام آئے گا نہیں
محشر میں ہیں کسی کا سہارا تو آپؐ ہیں

تھے یوں تو انجمن میں کئی اور بھی چراغ
جو پھیلتا گیا وہ اُجالا تو آپؐ ہیں

نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی کرن
بجھے دیوں کو ضیا بار بھی بناتا ہے

کوئی سفینہ جو موجوں کے نام کرتا ہے
تو ایک اسم کو پتوار بھی بناتا ہے

بدلتا رہتا ہے وہ اختیار کے موسم
کہ بادشاہ کو لاچار بھی بناتا ہے

سلگنے لگتے ہیں جب دھوپ کی تمازت سے
دھوئیں کو ابرِ گہر بار بھی بناتا ہے

کبھی کبھی تو وہ اتنی رسائی دیتا ہے
کہ سوچتا ہے، تو مجھکو سنائی دیتا ہے

کبھی وہ ہجر کے موسم میں دل میں کھلتا ہے
کبھی وصال کی صورت جدائی دیتا ہے

نہ جانے دیکھ لیا کیا، ہماری آنکھوں نے
کہ اب تو ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے

عجیب بات ہے، وہ ایک سی خطاؤں پر
کسی کو قید، کسی کو رہائی دیتا ہے

اگر وہ نام تمہارا نہیں، تو کس کا ہے؟
ہوا کے شور میں اکثر سنائی دیتا ہے

چلو وہ جھوٹ تھا، جو کچھ سنا تھا کانوں نے
تو پھر ان آنکھوں کو، یہ کیا دکھائی دیتا ہے؟

سرور ذکر سے مستی بیاں سے آئے گی
وہ نام لوں گا تو خوشبو زباں سے آئے گی

ہوا، چراغ بجھا کر تو بھر گئی بے مصرف
کہ روشنی، تو بہت آسماں سے آئے گی

ہمارے دل میں ترازو ہوا بھی تیر تو کیا
ہماری چیخ تو تیری کماں سے آئے گی

اجال دے گا مجھے اس قدر خیال اس کا
کہ روشنی سی مرے جسم و جاں سے آئے گی

اسے پکارتے رہتے تھے اس قدر کہ صدا
ہمارے بعد بھی خالی مکاں سے آئے گی

اگر بڑھی نہ زمینوں کی پیاس کی شدت
تو بادلوں میں روانی کہاں سے آئے گی

اسی امید پہ میں لَو لگائے بیٹھا ہوں!
کہ اب یقیں کی بشارت گماں سے آئے گی

ایک موہوم سے منظر کی طرح لگتا ہے
دشت، اب بچھڑے ہوئے گھر کی طرح لگتا ہے

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں، نہیں لکھا تھا
اب جو احوال، مقدر کی طرح لگتا ہے

کچھ اس انداز سے ہوتی ہے نوازش بھی کبھی
پھول بھی آئے، تو پتھر کی طرح لگتا ہے

جب ہواؤں میں، کوئی جلتا دیا دیکھتا ہوں
وہ مرے، اٹھے ہوئے سر کی طرح لگتا ہے

شدّتِ تشنہ لبی، ظرفِ طلب لے ڈوبی
اب تو قطرہ بھی سمندر کی طرح لگتا ہے

تیز ہوتا ہے، تو سینے میں اتر جاتا ہے
لفظ کا وار بھی، خنجر کی طرح لگتا ہے

ہر ایک قطرہ، پشیماں سا نکلتا ہے
پھر اسکی آنکھ سے، آنسو بِرا نکلتا ہے

لہو تو لہجہ بدل کر بھی، بولتا ہے کہ اب
نئے پھلوں سے وہی ذائقہ نکلتا ہے

کبھی تو لفظ، بہت پیچھے چھوٹ جاتے ہیں
پسِ سکوت ہی، تب مدعا نکلتا ہے

مہیب رات میں، پاگل ہوا کے نرغے سے
مرا چراغ ہی جلتا ہوا نکلتا ہے

نہ جانے، اس کی کہانی میں کتنے پہلو ہیں
کہ جب سنو، تو نیا واقعہ نکلتا ہے

تمام راہیں، جہاں آ کے ختم ہوتی ہیں
وہیں سے، ایک نیا راستہ نکلتا ہے

کبھی کبھی تو، کسی اجنبی کے ملنے سے
بہت پرانا کوئی سِلسلہ نکلتا ہے

خیال و خواب میں، اک اک نفس میں رہتا ہے
کہیں رہے، وہ مری دسترس میں رہتا ہے

دھڑکتا رہتا ہے یہ دل ہمارے سینے میں
تمام عمر مگر، اس کے بس میں رہتا ہے

تو اس کے سامنے، تنکا ٹھہر نہیں سکتا
کشش بھی، زور بھی، موجِ ہوس میں رہتا ہے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ ایسا لگنے لگے
وہ اپنے گھر میں نہیں، اک قفس میں رہتا ہے

سنائی دیتی ہے، ہر راستے میں وہ آہٹ
ضرور کوئی مرے پیش و پس میں رہتا ہے

بدلنے والا ہے، یہ انتظار کا موسم
یہ احتمال ہمیں ہر برس میں رہتا ہے

مرا خلوصِ طلب، کامیاب دیکھتا ہے
اب اپنی آنکھوں سے، وہ میرے خواب دیکھتا ہے

تو ہر ستارے کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں!
اگر وہ اس کو کبھی، بے نقاب دیکھتا ہے

لکھا ہوا ہے، وہیں کاروبارِ شوق کا حال!
وہ صرف چہرہ نہیں، اک کتاب دیکھتا ہے

ہر اک، زیاں کی تلافی بھی ہوتی رہتی ہے
کوئی تو ہے، جو ہمارا حساب دیکھتا ہے

وہ دن گئے کہ وہ دریا سمیٹ لیتا تھا
اب ایک قطرہ، سمندر کے خواب دیکھتا ہے

اب اس مقام پہ پہونچی ہے تشنگی کہ جہاں
ندی کے آئنے میں بھی، سراب دیکھتا ہے

ہری بھری تھیں بہت، جن سے کھیتیاں میری
کہاں برسنے لگیں، اب وہ بدلیاں میری

ہوا سے مل کے، سمندر ہوا تو خوش لیکن
اداس کرتی رہیں اس کو کشتیاں میری

ترے خطوط کی خوشبو، تو اب بھی زندہ ہے
پڑھوں، تو اب بھی مہکتی ہیں انگلیاں میری

اسی طرف سے کسی دن تو چاند نکلے گا
کھلی ہوئی ہیں اسی دھن میں کھڑکیاں میری

قصور اب میں کسی اور کا بتاؤں کیا
مرے خلاف ہی نکلیں گواہیاں میری

کسی طرح سے گریباں نے راستہ روکا
ہوا تو اب کے اڑا دیتی دھجیاں میری

راہِ سفرِ شوق کا، معیار تو ہوتا
کچھ حیلۂ طوق و رسن و دار تو ہوتا

ہر بار اسی مصر کی بازار میں بکنا
اب اور کہیں کوئی خریدار تو ہوتا

گوشہ تو کوئی ہوتا، مرے نام کا اس میں
گھر ہے تو کہیں سایۂ دیوار تو ہوتا؟

اس روز تو، جو چاہتے، ہو جاتی وہی بات
ایسا بھی کبھی زیست میں، اک بار تو ہوتا

پانی میں چمکتا ہوا، خوابوں کا جزیرہ
اس پار نہیں کوئی، تو اس پار تو ہوتا

گم ہو گئے اس خوف زدہ شب میں اگر خواب
کچھ حوصلہ دیدہ بیدار تو ہوتا

سن لیتا مری بات، وہ کہنے سے بھی پہلے
ایسا بھی کوئی ذریعۂ اظہار تو ہوتا

اب یہ بھی راہِ شوق کو عظمت تو مل گئی
منزل نہیں ملی، تو شہادت تو مل گئی

قربانیوں کا اتنا صِلہ بھی نہیں ہے کم
آئندگاں کو ایک روایت تو مل گئی

پھر آسماں عجیب پرندوں سے بھر گیا
لو، اگلے موسموں کی، بشارت تو مل گئی

کچھ دور ہی سہی، ابھی خوشبو کی آہٹیں
پھر دل کو، انتظار کی لذّت تو مل گئی

کچھ رنگ تو اُمید کے چہرے پہ آگیا
چلیے ہمارے خون کی قیمت تو مل گئی

اک سوکھتے شجر کو لہو کی سبیل سے
قوّت نہیں ملی، تو طراوت تو مل گئی

پریوں والے دیش کی رانی رہتی ہے
سات سمندر پار کہانی رہتی ہے

خوابوں کی نگری میں آنے جانے کی
ہر اک کو کتنی آسانی رہتی ہے

پانی پر، بس ایک سفینے کی خاطر
لہروں میں، کیا کھینچا تانی رہتی ہے

دن کو اس کا راز ابھی معلوم نہیں
کیسے میری شام سہانی رہتی ہے

لاکھ اسے پانا، ناممکن ہو جائے
اک صورت، پھر بھی امکانی رہتی ہے

رنگ کا لہو کا جتنا، بڑھتا جاتا ہے
اتنی ہی اس کی ارزانی رہتی

بہت پرانا اس کا قصّہ ہے لیکن
روز نئی اک بات سنانی رہتی ہے

منظرِ وصلِ شوق ہے، حد و حساب سے جدا
آنکھ، نگاہ سے الگ، چہرہ نقاب سے جدا

اب کے یہ موسمِ سیاہ، حال یہ کر گیا ہے کیا؟
نور چراغ سے خفا، رنگ گلاب سے جدا

ایسی کہاں کی پیاس ہے، کس کی اب اس کو آس ہے؟
اور یہ چاہتی ہے کیا، آب و سراب سے جدا

لفظ تو تھے، بیاں نہ تھا، بات سے کچھ عیاں نہ تھا
جب سے کیا تھا نام اک، اس نے کتاب سے جدا

دیکھنا کیا سنا نہیں، ایسا کبھی ہوا نہیں
اک سانحے نے کر دیا، کیف، شراب سے جدا

بات کا کوئی فیصلہ، ہو بھی اگر تو کس طرح
سارے سوال کر دیئے، اس نے جواب سے جدا

بس ایک لمحہ، ترے لمس کے چراغ جلے
اسی کی آنچ میں، پھر عمر بھر دماغ جلے

یہ فرق، گرتی ہوئی بجلیاں نہیں کرتیں
کہ آشیاں ہی جلے، یا تمام باغ جلے

اجالنا ہے ہمیں اب، انہی اندھیروں کو
پتہ نہیں کہ یہاں کب کوئی چراغ جلے

عجیب بات ہے، اس کے بدن کی خوشبو سے
تمام غنچہ و گل کیا، کہ سارا باغ جلے

نہ جانے کس کی نظر لگ گئی چراغوں کو
وہاں بھی روشنی کم ہے جہاں چراغ جلے

وہ بات، سامنے آجائے گی، تو کیا ہو گا
کہ سوچنے سے بھی جس کے دل و دماغ جلے

کھلتا نہیں، وہ اس کا رویہ عجیب ہے
میرے قریب ہے کبھی اس کے قریب ہے

گھر سے نکل پڑے ہیں، تو کیا دشت، کیا چمن
اب راستہ ہے، اور ہمارا نصیب ہے

اب تو مِرے بقا کی ضمانت سی ہو گئی
یوں تو فقط دکھوں کی علامت صلیب ہے

جب اپنے آپ سے بھی بہت دور ہو گئے
تب یہ پتہ چلا کہ وہ کتنا قریب ہے

یوں تو دیکھئے تو کوئی بڑی بات بھی نہیں
پر سوچئے تو واقعہ کتنا عجیب ہے

لاکھوں برس کی اپنی وراثت کے باوجود
آدم نژاد آج بھی کتنا غریب ہے

غضب تو یہ تھا، کہ وہ ترجمان اس کی تھی
ہمارے منہ میں بھی گویا زبان اس کی تھی

سفر کی سمت مقیّد تھی، بند مُٹھّی میں
کہ بال و پر تھے ہمارے، اڑان اس کی تھی

ہم اس زمیں پہ کسی اور کی امانت تھے
کہ صرف جسم ہمارا تھا، جان اس کی تھی

اس انکشاف سے کچھ اور زخم گہرے ہوئے
کسی کے تیر ہوں، لیکن کمان اس کی تھی

کوئی بھی چیز وہاں، قیمتی نہیں تھی مگر
تمام شہر میں اونچی دکان اس کی تھی

بس اتنی بات پہ خوش تھے کہ نام اپنا تھا
وگرنہ زیست کی ہر داستان اس کی تھی

وہ تیر آ کے لگا، جو کمان میں بھی نہ تھا
وہی ہوا ہے، جو وہم و گمان میں بھی نہ تھا

تمام بات اسی پر گئی کہ جس کے نام
زبان پر بھی نہیں تھا، بیان میں بھی نہ تھا

مجھی کو بڑھتے ہوئے فاصلوں کا شکوہ تھا
مرے علاوہ، کوئی درمیان میں بھی نہ تھا

مرے چراغ کا بجھنا بھی اک قیامت تھا
کہ پھر ستارہ کوئی آسمان میں بھی نہ تھا

ہوا کے جال بھی پھیلے ہوئے تھے دور تلک
کچھ اب کے زور ہماری اڑان میں بھی نہ تھا

اسی کے در کے سوالی بنے رہے لیکن
یہ جانتے تھے کوئی اس مکان میں بھی نہ تھا

ایک تحفہ اس طرف اب کے نیا لے جائیے
آگ کے جنگل میں، بارش کی دعا لے جائیے

مشعلیں اپنے یقیں کی، یا دعاؤں کے چراغ
اس اندھیری رات میں، کچھ تو جلا لے جائیے

ڈوب کر بھی، ساحلوں کے پاس ابھر آنے کا فن
تیز پانی کے سفر میں اور کیا لے جائیے

کس قدر خوشبو ہے، کتنے رنگ، کتنی روشنی
نام اس کا لیجیے اور سب اٹھا لے جائیے

اِس سفر کا، کوئی چہرہ، کوئی لذت، کوئی یاد
اپنے گھر کے واسطے کچھ تو بچا لے جائیے

ہر سلسلۂ گردشِ افلاک سے ملنا
اک روز، تمہارے دلِ صد چاک سے ملنا

نکلیں گے کسی روز، دفینے بھی یہیں سے
ملنا ہے اگر کچھ، تو اسی خاک سے ملنا

ہر عقدۂ مشکل کا، نکلتا ہے وہیں حل
سلجھے، تو کبھی زلف کے پیچاک سے ملنا

دے دینا اسے، اٹھے ہوئے سر کی دعائیں
ہو جائے اگر، خنجرِ بے باک سے ملنا

ہر شہرِ تمنّا میں، حکومت ہے اسی کی
گزرو، تو اسی صاحبِ املاک سے ملنا

ہر اشکِ تمنا کو گہر جس نے بنایا
موسم ہو تو اس دیدۂ نمناک سے ملنا

٭

ہے انتظار وہی، اور وہی جنون سا ہے
پر آس ٹوٹ گئی ہے تو کچھ سکون سا ہے

دل و نگاہ کے آداب، کون مانتا ہے
کہ کارِ عشق بھی، اب جنگ کے فنون سا ہے

ہزار موجیں تہ آب، پیچ و تاب میں ہیں
اگرچہ سطحِ سمندر پہ کچھ سکون سا ہے

میں مانتا ہوں، کسی کا لہو، نہیں لیکن
لگا ہوا ترے دامن پہ، کچھ تو خون سا ہے

تمہارے ساتھ، اچانک بدل گیا موسم
لگا کہ سرد دسمبر بھی، گرم جون سا ہے

کسی کی تشنہ لبی، سرخرو ہوئی تھی کبھی
تو اب بھی نہر کے پانی کا رنگ خون سا ہے

جانتا ہوں، کہ مرے ہاتھ تو جل جائیں گے
راکھ میں دفن جو شعلے ہیں، نکل جائیں گے

یہ جو اک تم سے تعلق ہے، اسے توڑنا مت
ورنہ اس لفظ کے معنی ہی بدل جائیں گے

کوئی آواز، اسی سمت سے پھر آئے گی
ہم بھی، پھر اس کے تعاقب میں نکل جائینگے

پھر کوئی چہرہ، اندھیرے میں کرن کی صورت
پھیلتا جائے گا، اور دیے سے جل جائیں گے

لوٹ کر آنے سے پہلے، کبھی سوچا بھی نہ تھا
ہم کسی اور سفر پر بھی، نکل جائیں گے

ڈوبنے والوں سے، دریا نے کہا تھا "آؤ"
میرے پانی سے، سبھی پار نکل جائیں گے

شاہراہیں تو، اسی شہر تلک جاتی تھیں
پھر بھی ڈر تھا، کہ کہیں اور نکل جائیں گے

چند قطرے بھی، سمندر میں اگر زندہ ہیں
بڑھتے بڑھتے وہی، طوفان میں ڈھل جائیں گے

یا شہرِ جنوں ویران ہوگیا ہے
یا وحشی تن آسان ہوگیا ہے

یا آہٹ سیراب خو ہوگئی ہے
یا سناٹا خوش گمان ہوگیا ہے

یا آگ بدن کی بجھ چکی ہے
یا لمس ترا بے جان ہوگیا ہے

اک بھیڑ بھٹکتی پھر رہی ہے
لیکن رستہ سنسان ہوگیا ہے

مشکل تھا بچھڑ کے اس سے جینا
رفتہ رفتہ آسان ہوگیا ہے

سب رنگ ہیں تجھ سے ملتے جلتے
موسم بھی تری پہچان ہوگیا ہے

میں روز روز کا قضیہ تو پاک کر دیتا
پر اپنے آپ کو کیسے ہلاک کر دیتا

جنوں میں ایک نئی رسم کی بنا پڑتی
اگر میں اس کا گریباں کبھی چاک کر دیتا

تو اس کے بعد بھی، یہ رات کاٹ دیتے ہم
اگر وہ اور اسے ہولناک کر دیتا

بچا لیا مری مٹی کی آبرو نے مجھے!
نہیں تو آج وہ پیوندِ خاک کر دیتا

بھلا ہوا کہ مری ہر دعا قبول نہ کی
وگرنہ میں تو زمانے کو خاک کر دیتا

اگر سنبھال کے رکھتا وراثتیں اپنی!
تو موم تیغ کو، دریا کو چاک کر دیتا

یہی نہیں کہ بس اک سائبان ٹوٹتا ہے
پھر اس زمین پہ مرا آسمان ٹوٹتا ہے

بس اِک چراغ جلانے کا خوف اتنا ہے
کہ ایک لشکرِ ظلمات آن ٹوٹتا ہے

خطا، تو اور زمینیں بھی کرتی رہتی ہیں
تو صرف ہم پہ ہی، کیوں آسمان ٹوٹتا ہے

نہ جانے اور ابھی کتنے حادثے ہوں گے
کہ صرف آس نہیں اک جہان ٹوٹتا ہے

پھر ایک دوسری دیوار درمیاں آئی
پھر ایک سلسلہ جسم و جان ٹوٹتا ہے

ہوائیں تیز ہیں، پھر بھی سفر تو کرنا ہے
تو ٹوٹ جائے اگر بادبان ٹوٹتا ہے

بتانے والا ہی ہوتا ہے جب کوئی تعبیر
ہمارا خواب، اُسی درمیان ٹوٹتا ہے

جانے کس کس کو مددگار بنا دیتا ہے
وہ تو تنکے کو بھی پتوار بنا دیتا ہے

ایک اک اینٹ گراتا ہوں میں دن بھر لیکن
رات میں پھر کوئی دیوار بنا دیتا ہے

وہ کچھ ایسا ہے گزرتا ہے ادھر سے جب بھی
شہر کو مصر کا بازار بنا دیتا ہے

لفظ ان ہونٹوں پہ ، پھولوں کی طرح کھلتے ہیں
بات کرتا ہے تو گلزار بنا دیتا ہے

مسئلہ ایسا نہیں ہے ، مرا ہمدرد مگر
کچھ اسے اور بھی دشوار بنا دیتا ہے

جنگ ہو جائے ہواؤں سے تو ہر ایک شجر
نرم شاخوں کو بھی تلوار بنا دیتا ہے

حرف و نوا کی قید سے آزاد ہو گئے
جب لفظ میری آنکھ میں آباد ہو گئے

خوش رنگ تتلیوں کے تعاقب کا شوق تھا
بچے بھی کھیل میں جلاد ہو گئے

کتنا نصاب شوق بھی تبدیل ہو گیا
سب بھولنا پڑے جو سبق یاد ہو گئے

ٹھنڈی ہوا چلی، تو کلی دل کی کھل گئی
اس کی مہک ملی تو بہت شاد ہو گئے

وہ آس پاس نہیں، پھر یہ سلسلہ کیسا؟
اجاڑ دشت میں، خوشبو کا قافلہ کیسا؟

غبار ہو تو گئے ہم، مگر یہ سچ کہنا
ہوا کے ساتھ، رہا تھا مقابلہ کیسا؟

کسی کے بارے میں دن رات سوچتے رہنا
ہمارے ہاتھ بھی آیا ہے مشغلہ کیسا؟

جو زیرِ آب کہیں کوئی کشمکش ہی نہ تھی
تو سطحِ آب پہ پھوٹا تھا بلبلہ کیسا؟

لکھا ہوا تھا کہ آگے نہیں کوئی بستی
تو اس کے بعد، سفر کا یہ سلسلہ کیسا؟

ہمارے کام بگڑ کر سنورتے رہتے تھے
مگر ہوا ہے یہ اب کے معاملہ کیسا؟

کسی طرح، نہ یہ الزام سر سے اُٹھے گا
میں جل گیا تو دھواں اس کے گھر سے اُٹھے گا

یہ سوچ لینا کہ ہم آخری مسافر ہیں
غبار پھر نہ تری رہگذر سے اُٹھے گا

کوئی جواب نہ دے گا اجاڑ گھر سے مگر
عجیب شور سا، دیوار و در سے اُٹھے گا

کنارے اس کی طرف ہیں، ہوائیں میری طرف
یہ دیکھنا ہے، کہ طوفاں کدھر سے اُٹھے گا

اسی امید پہ روشن ہے آگ سینے میں
کبھی تو شعلہ کوئی، چشمِ تر سے اٹھے گا

ہم اپنا نام تو لکھ دیتے اس کی شاخوں پر
مگر یہ بار کہاں، اس شجر سے اٹھے گا

اِس طرح نگاہوں پہ نہ چھا جائے کوئی اور
آئینہ بھی دیکھیں، تو نظر آئے کوئی اور

اب شہر میں، انصاف کی یہ رسم چلی ہے
ہو جرم کسی کا، تو سزا پائے کوئی اور

سچا ہے تعلق، تو کبھی یوں بھی تو ہو جائے
ہو درد ہمارے، تو تڑپ جائے کوئی اور

اتنی تو ملے داد ہمیں، لغزشِ پا کی
گر جائیں اگر ہم، تو سنبھل جائے کوئی اور

میں تو ترے دھوکے ہی میں، اِس سمت چلا تھا
کیا میری خطا، گر وہ نکل آئے کوئی اور

دامنِ شوق کو پھولوں سے بھرا رکھنا تھا
کوئی موسم ہو، ہر اک زخم ہرا رکھنا تھا

جیت ممکن تھی، ہماری تو اسی صورت میں
داؤ پر اور بھی، کچھ جاں کے سوا رکھنا تھا

یاد آتا ہے بہت، بے سروسامانی میں
کھو دیا وہ بھی، جو اک حرفِ دعا رکھنا تھا

شہرِ امید میں، اب بند پڑے سوچتے ہیں
واپسی کا، کوئی دروازہ کھلا رکھنا تھا

ساتھ دینا تھا ہواؤں کا بھی کچھ دیر تلک
اور چراغوں کو بھی، تا صبح جلا رکھنا تھا

یہ مانتا ہوں دعا بے اثر نہیں ہوتی
مگر قبول کبھی وقت پر نہیں ہوتی

ہماری آنکھوں میں، دریا کا سوکھنا دیکھو
کہ آنسوؤں سے بھی اب آنکھ تر نہیں ہوتی

وہ جان لیتا ہے کیسے کچھ ایسی باتیں بھی
ہمیں بھی جن کی کوئی بھی خبر نہیں ہوتی

عجیب بات ہے یہ، آنکھ کی گواہی بھی
خلافِ دل ہو تو کچھ معتبر نہیں ہوتی

بدل گئی ہے فضا، موسموں کے ساتھ اتنی
کہ اب صبا بھی تری نامہ بر نہیں ہوتی

وہ تیر چھوڑا ہوا تو، اسی کمان کا تھا
اگرچہ ہاتھ، کسی اور مہربان کا تھا

گزر رہا تھا وہ لمحہ، جو درمیان کا تھا
مگر یہ وقت بڑے سخت امتحان کا تھا

پتہ نہیں، کہ جدا ہو کے، کیسے زندہ رہیں
ہمارا اس کا تعلق، تو جسم وجان کا تھا

ہوا تو چلتی ہی رہتی ہے اس سمندر میں
قصور کوئی اگر تھا، تو بادبان کا تھا

وہی کہانی کبھی جھوٹ تھی، کبھی سچ تھی
ذرا سا فرق اگر تھا، تو بس بیان کا تھا

قدم قدم پہ، نئے منظروں کی حیرت تھی
تری گلی کا سفر تھا، کہ اک جہان کا تھا

ہم اپنے نام کے حصّے کو ڈھونڈھتے بھی کہاں
زمیں کے پاس تو جو کچھ تھا، آسمان کا تھا

کہیں زمین پر ثانی نہیں ملا اس کا
وہ شخص جیسے کسی اور آسمان کا تھا

سنو، کہ اب بھی سمندر انھیں بلاتے ہیں
سفر کے بعد، جو سب کشتیاں جلاتے ہیں

مرا خیال ہی سچّا ہے، اپنے بارے میں
وہ جھوٹ ہوگا، جو یہ آئینے بتاتے ہیں

خراج دیتے ہیں، اک ایک سانس کا اپنی
جو قرض ہم پہ نہ تھا، عمر بھر چکاتے ہیں

اسے خبر بھی نہیں، اس قدر تعلق کی
وہ دھوپ میں ہے، پسینے میں ہم نہاتے ہیں

اسی امید پہ عمریں گزار دیں ہم نے!
وہ کہہ گیا تھا، کہ موسم پلٹ کے آتے ہیں

ہماری سادہ مزاجی، عذاب ہے کتنی
تکلّفات کو، سچائی مان جاتے ہیں

پھولوں کی کشتیاں ہیں سمندر پہ ہے زنگ کا
پھر قافلہ روانہ ہوا ہے امنگ کا

اس خوش بدن کی بات تھی اور لفظ تھے مرے
اک ایک حرف، آئینہ تھا انگ انگ کا

حرکت ہماری، اس کے اشارے پہ یوں رہی
جیسے کہ ڈور سے ہے تعلق پتنگ کا

وہ لب، کلید حرف و نوا تھے، بیان کی
کھلتا گیا طلسم، معانی کے رنگ کا

اس سلسلے کو توڑنا، اچھا نہیں لگا
سر سے بڑا پرانا تعلق تھا سنگ کا

اک نام لوحِ وقت پہ میں نے بھی لکھ دیا
وہ دور بھی عجب تھا، لہو کی ترنگ کا

پہلے تیر زبان سے نکلا
اس کے بعد کمان سے نکلا

ایک بڑا خوش رنگ شگوفہ
یادوں کے گلدان سے نکلا

قربت کا اک اور بھی پہلو
دوری کے امکان سے نکلا

قصہ جب اس نے دہرایا
مطلب اور بیان سے نکلا

حیرت ہے، اب وہ لمحہ بھی!
تیرے میرے دھیان سے نکلا

دیکھا تو برسوں کا رشتہ!
اک دن کے مہمان سے نکلا

لہو میں اس سے، ابال سا تھا
جو حرف، خواب و خیال سا تھا

جو زندگی تھی، اسی سے کٹ کر
ہمارا جینا، کمال سا تھا

میں جس سے نظریں بچا رہا تھا
اس آنکھ میں اک سوال سا تھا

اسی زمانے میں، میں کہاں تھا؟
کہ جس کی زندہ مثال سا تھا

اداس موسم کے ساتھیوں میں
بچا تھا دل، سو نڈھال سا تھا

تری رفاقت کا لمحہ لمحہ!
مرے لئے، ماہ و سال سا تھا

خواب ایسے، نہ کسی کے ڈھل جائیں
نیند تجھ کے نام سے آنکھیں کھل جائیں

اب تو دیوار کو حیرانی دے
آج تو دھوپ میں سائے کھل جائیں

اب ہواؤں کے سبھی دروازے
بادبانوں کی طرف کھل جائیں

زندگی تب ہی ہمیں مانے گی
جان دینے پہ اگر تل جائیں

روح شرمندہ تو ہوتی ہوگی؟
جسم کے راز اگر کھل جائیں

اس کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہی
لفظ میں شیر و شکر کھل جائیں

سر پہ تھی کڑی دھوپ، بس اتنا ہی نہیں تھا
اس شہر کے پیڑوں میں تو سایا ہی نہیں تھا

پانی میں ذرا دیر کو، ہلچل تو ہوئی تھی
پھر یوں تھا، کہ جیسے کوئی ڈوبا ہی نہیں تھا

کندہ تھے مرے ذہن پہ، کیوں اس کے خد و خال
چہرہ، جو مری آنکھ نے دیکھا ہی نہیں تھا

لکھے تھے سفر پاؤں میں، کس طرح ٹھہرتے
اور یہ بھی، کہ تم نے تو پکارا ہی نہیں تھا

اپنی ہی نگاہوں پہ بھروسہ نہ رہے گا
تم اتنا بدل جاؤ گے سوچا ہی نہیں تھا

ہر لفظ کے معنی ہی بدل ڈالے تھے شاید
یا بات ہماری، کوئی سمجھا ہی نہیں تھا

یہ حادثہ بھی مری بے بسی پہ گزرا تھا
سوال کوئی نہ تھا اور ہاتھ پھیلا تھا

ہوائیں چیختی، بادل کڑکتے پھرتے تھے
بس اک چراغ بجھانے کو یہ جھمیلا تھا

نگل رہی تھی ہمیں جب زمین کی گہرائی
یہ آسمان ہمارے سروں پہ پھیلا تھا

ہوا چلی، تو بھرم کھل گیا سہاروں کا
جہاز ڈوب رہا تھا، تو میں اکیلا تھا

ہر ایک شخص سمجھتا تھا، دوسروں کو برا
اور اس دیار میں ہر شخص آئینہ سا تھا

شاخیں رہیں تو پھول بھی پتے بھی آئینگے
یہ دن اگر برے ہیں تو اچھے بھی آئینگے

اس گھر میں پھول جیسے فرشتے بھی آئینگے
اسکول جب کھلیں گے، تو بچے بھی آئینگے

سورج نکل تو آئے گا اس شب کے بعد بھی
اس کا یقیں نہیں کہ اُجالے بھی آئینگے

ٹوٹی ہوئی کمان کو اب تک یہ آس ہے
اک دن اسے سنبھالنے والے بھی آئینگے

خوشبو بتا رہی ہے یہ سوکھی زمین کی
اس دشت ہی میں سبز علاقے بھی آئینگے

شاخِ بدن پہ پھول کھلانے کی رُت تو آئے
بادل زمینِ دل پہ برسنے بھی آئینگے

حالات بدلنے کا، امکان بھی رکھتے ہیں
قطرے ہیں، مگر دل میں طوفان بھی رکھتے ہیں

اڑتی ہوئی خوشبو کا، جاتا ہوا جھونکا ہوں
پھولوں سے مگر عہد و پیمان بھی رکھتے ہیں

آوارہ بھٹکنے کی لذّت بھی ہماری ہے
منزل کی رسائی پہ ایمان بھی رکھتے ہیں

بینائی پہ ہم کوئی، الزام نہیں لیتے
آنکھوں کو مگر اپنی حیران بھی رکھتے ہیں

اس بھیڑ میں شامل ہیں، پر اس کے حوالے سے
ہونے کی الگ اپنی پہچان بھی رکھتے ہیں

آئینہ نہیں، ہیں ہم، بس تیری پچھلی روایت کا
آئندہ زمانوں کا، عرفان بھی رکھتے ہیں

کہاں کہاں کے ارادے، سفر سے پہلے تھے
تمام موڑ مگر، اس کے گھر سے پہلے تھے

خود اپنے آپ کو، محصور کر لیا، ورنہ
غضب کے حوصلے، دیوار و در سے پہلے تھے

یقین کیسے کریں اب، کہ گل رتوں کے بھی
بہت قریب کے رشتے شجر سے پہلے تھے

اگر رکے، تو کہیں اور رکے رہے ہی نہیں
عجب پڑاؤ، تری رہ گزر سے پہلے تھے

کہ جو بھی دیکھا، اسی روشنی میں دیکھا ہے
وہ میری آنکھ میں، جیسے نظر سے پہلے تھے

اب ان چراغوں کو، میں بھولتا سا جاتا ہوں
جو میرے ساتھ، نمودِ سحر سے پہلے تھے

بغیر حرف و نوا کے بیاں بنایا ہے
اب اپنی آنکھوں کو، ہم نے زباں بنایا ہے

ہماری پیاس بھی، بادل کی سمت دیکھتی ہے
اسی قصور نے، صحرا بجاں بنایا ہے

اک اور دل بھی دھڑکتا ہے اس کے سینے میں
عجیب سلسلۂ ربطِ جاں بنایا ہے

یہ طول و عرض زمیں صرف آشیاں بھر ہے
اڑان بھر ہی، فقط آسماں بنایا ہے

بس ایک نام تھا، جو بار بار لیتا تھا
اور اتنی بات کو، اک داستاں بنایا ہے

یہ کیا سمائی، کہ منظور ہاشمی تم نے!
لہو کو آگ، بدن کو دھواں بنایا ہے

ہر ایک لمحہ، بالآخر عذاب ہی نکلا
سکون، سلسلۂ اضطراب ہی نکلا

میں اپنی پیاس کو، سیراب کرنے اترا تھا
ڈبو دیا، تو وہ دریا سراب ہی نکلا

نواحِ جاں میں، بہت روشنی رہی، کچھ دن
پر اس کا چہرہ، سنہری نقاب ہی نکلا

میں اپنی آنکھیں بھی، اس پر نثار کر دیتا
مگر، وہ منظرِ خوش رنگ، خواب ہی نکلا

میں لفظ لفظ، صحیفہ سمجھ رہا تھا جسے
ورق کھُلے تو وہ سادہ کتاب ہی نکلا

تمام باتوں کا، جب جائزہ لیا ہم نے
تو اس کے ذمے، ہمارا حساب ہی نکلا

کٹی پھٹی ہوئی تحریر لے کے آیا تھا
عجب نوشتۂ تقدیر لے کے آیا تھا

تھکن سے چور پرندہ نہ جانے کس کے لئے؟
لہو میں ڈوبا ہوا تیر لے کے آیا تھا

بلا کی کاٹ تھی اک ایک لفظ میں اس کے
نیامِ نطق میں شمشیر لے کے آیا تھا

تمام شہر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا
عجیب جذبۂ تعمیر لے کے آیا تھا

میں بے گناہ تھا لیکن اس کا کیا کرتا ؟
گناہگار کی تقدیر لے کے آیا تھا

بدن کی چٹکی ہوئی چاندنی کی آنچ نہ پوچھ
کہ برف آگ کی تاثیر لے کے آیا تھا

اسی پہ بند ہوئے روشنی کے دروازے
جو رنگ و نور کی جاگیر لے کے آیا تھا

ادھر سے کھلتی، ادھر سے لپٹتی جاتی تھی
میں اک عجیب سی زنجیر لے کے آیا تھا

جدا ہوتے ہوئے، ہم اپنی آنکھیں چھوڑ آئے ہیں
کہ اس سے ایک رشتہ دور کا بھی جوڑ آئے ہیں

کوئی آواز آئی تھی، چٹخنے کی، بکھرنے کی!
نکلتے وقت گھر سے، جانے ہم کیا توڑ آئے ہیں؟

یہی سچ ہے کہ طغیانی میں سب مجبور ہوتے ہیں
ہمیں بھی چھوڑ دیتے وہ، جنھیں ہم چھوڑ آئے ہیں؟

وہ ساعت آخرش، آ ہی گئی، جس کو نہ آنا تھا
کہ اک لمحے میں، ہم برسوں کے رشتے توڑ آئے ہیں

بتایا تھا، کہ سچا بھی ہے، سیدھا بھی یہی رستہ
اسی رستے میں لیکن، کیسے کیسے موڑ آئے ہیں

یہاں تک آتے آتے، ہو گئے ہم دوسرا کوئی
تو اپنے آپ کو، کیا رستے میں چھوڑ آئے ہیں

نہ جانے کتنے سفر کر کے ہم نے جانا تھا
ہر اک زمیں پہ وہی آسماں پرانا تھا

یہ چاہتے تھے، کہ ایسا خدا کرے کہ نہ ہو
یہ جانتے تھے، کہ رشتوں کو ٹوٹ جانا تھا

عجیب بات ہوئی، آج تک سفر میں ہیں
وہ لوگ بھی، کہ جنھیں تھوڑی دور جانا تھا

نہ جانے شہر کا کیا حال، بارشوں میں ہوا؟
کہ جب چلے تھے، تو برسات کا زمانہ تھا

کڑی کمان کے تیروں کو، دیکھ کر خوش تھا
مجھے خبر ہی نہیں تھی، کہ میں نشانہ تھا

ہمارا ذکر نہیں تھا، ہمارے قصّے میں
کہ جیسے وہ بھی کسی اور کا فسانہ تھا

چمکتے سونے سے دن تھے، مہکتے پھول سی رات
ہمارے پچھلے جنم میں بھی، کیا زمانہ تھا

اے ہوا، ہم جو ہٹ گئے ہوتے
سارے نقشے، الٹ گئے ہوتے

زندگی، تو ہی بے حیا نکلی!
شرم سے، ہم تو کٹ گئے ہوتے

چھوڑ کر گھر خیال آتا ہے
بام و در سے لپٹ گئے ہوتے

راستے کا غرور توڑنا تھا
ورنہ کب کے، پلٹ گئے ہوتے

وہ اگر میرا ہم سفر ہوتا
فاصلے بھی، سمٹ گئے ہوتے

وصل کی رات مختصر تھی اگر
ہجر کے دن بھی گھٹ گئے ہوتے

یہ تو نہیں کہ شکل و شباہت اسی کی تھی
لیکن ہر ایک پھول میں نکہت اسی کی تھی

خط میں، کسی کا نام تو لکھا ہوا نہ تھا
خوشبو بتا رہی تھی، عبارت اسی کی تھی

آنسو، سکون بخش تھے، تھا درد، جانفزا
اک اسم تھا یہ ساری کرامت اسی کی تھی

پھیلا ہوا تھا دور تلک، اس کا سلسلہ
قصّے الگ الگ تھے، حکایت اسی کی تھی

چہرے تو اور بھی تھے، نگاہوں کے سامنے
لیکن ہر ایک آنکھ میں، حسرت اسی کی تھی

ہم تو بس اپنی آنکھ کے محرم بنے رہے
منظر تمام، اس کے تھے، حیرت اسی کی تھی

گلاب لفظ ہوئے مشکبو معانی ہوئے
سخن کیا، تو فضاؤں کے رنگ دھانی ہوئے

ہوائیں اڑنے لگے اس کے ذکر پر الفاظ
خرامِ ابر ہوئے، موج کی روانی ہوئے

مرے قدیم چراغوں میں، کیا کرامت تھی
اگر بجھے، تو نئی صبح کی نشانی ہوئے

اب اس کے بعد کی منزل، نہ جانے کیا ہوگی؟
کہ اِک زمانہ ہوا ہے، لہو کو پانی ہوئے

کہیں کہیں، کوئی کردار اب بھی زندہ ہے
اگرچہ دیر ہوئی، ختم وہ کہانی ہوئے

نہ جانے کون سی دھن پر لگا دیا اس نے
ہمارے گیت، ہمارے ہی نوحہ خوانی ہوئے

کبھی کبھی تو یہ الفاظ، ساتھ دے نہ سکے
تو ہمکلام، پھر ہم اس سے بے زبانی ہوئے

گزرے ہوئے تمام مناظر، نظر میں ہیں
گھر میں بھی اس طرح ہیں کہ جیسے سفر میں ہیں

پتھراؤ کرنے والے بہت دور بین ہیں
کچھ پھل ضرور اب بھی، ہمارے شجر میں ہیں

یا تنگ ہوگئیں ہیں فضاؤں کی سرحدیں
یا وسعتیں تمام مرے بال و پر میں ہیں

تھا کس کا انتظار، کہ اُجڑے مکان میں
آنکھیں سی اب بھی چپکی ہوئی، بام و در میں ہیں

ان تیز آندھیوں سے بچیں گے کہاں درخت
محفوظ جنگلوں میں ہیں اب کے نہ گھر میں ہیں

منظور سب ہمیں ہیں ترے شہر کے عذاب
محسوس تو کریں کہ ہم اپنے گھر میں ہیں

لبوں پہ کوئی اگر حرف مدعا ہی نہیں
یہ کیسے مان لیا، کچھ وہ چاہتا ہی نہیں

روانہ ہونے کی ساعت نکلنے والی ہے
تو بادباں بھی کرے کیا، اگر ہوا ہی نہیں

یہ کس طرح کا یقیں ہے کہ دل اب اس کے خلاف
گواہیاں، مری آنکھوں کی مانتا ہی نہیں

کبھی کبھی تو، بہت انتظار رہتا ہے
اک ایسے شخص کا، جو مجھکو جانتا ہی نہیں

اب ایسے عالم ہو میں، صدا لگاتا ہے
لہو بھی جاگ اٹھے، مرف دست پا ہی نہیں

بس ایک بات میں وہ سلسلہ بھی ختم ہوا
سمجھ رہے تھے کوئی جس کی انتہا ہی نہیں

مجھے یقین ہے تم نے تو پڑھ لیا ہوگا
وہ خط جو میں نے تمہیں آج تک لکھا ہی نہیں

یہ مانتا ہوں، کوئی شے بھی جاودانی نہیں
مگر ضرور ہے ایسا کوئی جو فانی نہیں ؟

بہت دِنوں سے پکارا نہیں اُسے میں نے
بہت دِنوں سے مرے خون میں روانی نہیں

پھر اس کے بعد، بہت اختیار دے دیتا
بس ایک شرط تھی اُس کی، جو ہم نے مانی نہیں

وہ دن بھی تھے کہ اشارے زبان رکھتے تھے
اور آج لفظ بھی ایسے، کہ کچھ معانی نہیں

کوئی سنائے، تو اب داستاں سی لگتی ہے
ہماری بات، جو اتنی ابھی پرانی نہیں!

اُڑا دیے ہیں، سبھی رنگ دھوپ نے ایسے
کہ آسماں کا بھی اب رنگ، آسمانی نہیں.

شاخ پر گر ایک بھی پتہ ہرا رہ جائے گا
ہر شجر میں زندگی کا حوصلہ رہ جائے گا

روشنی کو بھی، چراغوں کی ضرورت ہے بہت
اک اگر بجھ بھی گیا، تو دوسرا رہ جائے گا

راہ کا پہلا قدم، اک جست ہے منزل کی سمت
پھر تو بس اک دو قدم کا فاصلہ رہ جائے گا

آخرش میدان میں، اک روز اس کے سامنے
ایک میں اور ایک بس میرا خدا رہ جائے گا

کس نے سوچا تھا، تعلق ٹوٹنے کے بعد بھی
اس سے اتنا ہی قریبی واسطہ رہ جائے گا

وہ تو کہیے، آنکھ میں اتنی بصارت ہی نہیں
ورنہ جو دیکھے گا اس کو، دیکھتا رہ جائے گا

سینے میں فصلِ گُل کے کھٹک چھوڑ جاؤنگا
پامال بھی ہوا تو مہک چھوڑ جاؤنگا

وہ ابر ہوں اڑا نہ سکے گی جسے ہوا
پانی برس گیا تو دھنک چھوڑ جاؤنگا

روشن رہے گی لفظ و معانی کی سلطنت
تحریر میں میں اتنی دمک چھوڑ جاؤنگا

اٹھا رہے گا تیز ہوا میں بھی اس کا سر
شاخِ شجر میں اتنی لچک چھوڑ جاؤنگا

راضی نہ ہوگا کوئی ادھوری حیات پر
بھرپور زندگی کی جھلک چھوڑ جاؤنگا

خواب کچھ شاداب شاخوں کے دکھا کر لے گیا
زرد پتوں کو ہر اک جھونکا اڑا کر لے گیا

موم کے پتلے تھے ہم، اور گرم ہاتھوں میں رہے
جس نے جو چاہا، ہمیں ویسا بنا کر لے گیا

تھک چلا تھا میں، مگر وہ ذوقِ منزل کا بھلا
راستے بھر اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر لے گیا

جس کے پانی کو دعا دیتی رہی پیاسی زمیں
ایک دن فصلیں، وہی دریا بہا کر لے گیا

راستے کی چیز تھا میں، جس کی نظریں پڑ گئیں
وہ مسافر، اپنی مٹھی میں دبا کر لے گیا

ہاں مری آنکھوں نے، دیکھی ہیں سنہری جنتیں
وہ ملا، تو آسمانوں پر اڑا کر لے گیا

عجیب رنگ، مرے دھوپ کے دیار میں تھا
شجر، خود اپنے ہی سائے کے انتظار میں تھا

نہ جانے، کون سے موسم میں، پھول کھلتے ہیں
یہی سوال خزاں میں، یہی بہار میں تھا

ہر ایک سمت ہوا کے عظیم لشکر تھے
اور اک چراغ ہی، میدانِ کارزار میں تھا

کھنچی ہوئی تھی مرے گرد، واہموں کی لکیر
میں قید، اپنے بنائے ہوئے حصار میں تھا

کوئی مکیں تھا، نہ مہماں آنے والا تھا
تو پھر کواڑ کھلا، کس کے انتظار میں تھا

مرے شجر پہ، مگر پھول پھل نہیں آئے
وہ یوں تو پھلتے درختوں ہی کی قطار میں تھا

نگاہ جس کے لیے عمر بھر دہائی دے
کوئی تو ایسا بھی منظر ہمیں دکھائی دے

بصارتوں کو نظر آئے صرف اک چہرہ
سماعتوں کو بس اک نام ہی سنائی دے

یہ کشمکش تو مسلسل عذاب ہے جیسے
ہمیں گناہ کی جرأت تو پارسائی دے

کوئی سہانا سا موسم کبھی ٹھہر جائے
کبھی تو گردشِ ایام سے رہائی دے

کوئی تو ٹوٹے ہوئے حوصلوں کا دل رکھے
کوئی تو بگڑی ہوئی بات کی صفائی دے

کبھی تو رنگ، مری مٹھیوں میں آجائیں
کبھی تو لمس کو خوشبو تلک رسائی دے

برائے بیت فقط، اس میں نام میرا تھا
تمام لفظ تھے اس کے، کلام میرا تھا

جو داستاں سنائی گئی، وہ اس کی تھی
مگر ہوا ہے جو قصہ تمام میرا تھا

بھلا سا نام تھا، لیکن کوئی نشاں نہ پتہ
اور اس کو ڈھونڈھتے ہی رہنا کام میرا تھا

بہت دنوں میں پتہ چل سکا کہ یہ گھر بھی
بس اک سرائے تھی، جس میں قیام میرا تھا

دعائیں دیتا نہ اس کو تو اور کیا کرتا
بغیر اس کے بھی، جینا حرام میرا تھا

کوئی پوچھے، تو نہ کہنا، کہ ابھی زندہ ہوں
وقت کی کوکھ میں، اک لمحۂ آئندہ ہوں

زندگی کتنی حسیں، کتنی بڑی نعمت ہے
آہ! میں ہوں، کہ اسے پا کے بھی شرمندہ ہوں

اجنبی جان کے ہر شخص گزر جاتا ہے
اور صدیوں سے، اسی شہر کا باشندہ ہوں

زندگی، تو جو سُنے گی، تو ہنسی آئے گی
لوگ کہتے ہیں، کہ میں تیرا نمائندہ ہوں

مجھکو حصے میں ملی، ڈوبتے سورج کی کرن
اس وراثت سے مگر آج بھی تابندہ ہوں

تیز رفتار ہوائیں مجھے دہراتی ہیں!
حرفِ آخر ہوں، میں اک نغمۂ پائندہ ہوں

انگاروں کو پھول بنانا، فن میرا
بھرا رہا، ہر موسم میں دامن میرا

رات ہوئی تھی چھت پر بارش چاندی کی
صبح بھرا تھا سونے سے آنگن میرا

اس کے نام کا اک اک حرف چمکتا ہے
اس کے اسم سے، ہر رستہ روشن میرا

کھلا ہوا ہے پھول سا چہرہ آنکھوں میں
مہک اٹھا ہے، خوشبو سے تن من میرا

بارش کے، ہر موسم میں، یہ سوچتا ہوں
شاید اب کے آجائے ساون میرا

سب کہتے ہیں، بڑا خزانہ نکلے گا!!
کوئی نہیں کرتا، لیکن منتھن میرا

اب اس عمر میں، دیکھ کے، کتنا حیراں ہوں
ہمک رہا ہے گھر میں پھر بچپن میرا

ایک تماشا اتنا حیرت ناک ہوا
دیپ خود اپنی آگ میں جل کر خاک ہوا

ہونٹوں سے جب لفظ کا رشتہ ٹوٹ گیا
بات کہاں کی سارا قِصّہ پاک ہوا

ایسا وقت پڑا ہے میکر پانی پر
خشکی والا بھی، اس کا تیراک ہوا

اونچے پربت کی چوٹی بھی ڈوب گئی
گہرے پانی کا سینہ بھی چاک ہوا

رفتہ رفتہ، خاموشی، اظہار بنی
خوشبو سے ہی، پھولوں کا ادراک ہوا

دستِ صبا کو چوم لیا، پھولوں کی طرح
اب تو غنچہ بھی، اتنا بے باک ہوا

سوادِ شام میں اک انتشار سا کیوں ہے
افق کے پاس یہ گرد و غبار سا کیوں ہے

یہ جانتا ہوں کہ اب معجزے نہیں ہونگے
تو اس کے بعد بھی اک انتظار سا کیوں ہے

لگائی ہوگی گھروں میں یہ آگ دشمن نے
ہمارا دوست جگر شرمسار سا کیوں ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا، کہ اس کی باتوں کا
یقیں نہیں ہے تو پھر اعتبار سا کیوں ہے

یہی ہوا تھا کہ اس نے پلٹ کے دیکھا تھا
بس اتنی سے بات پہ دل بیقرار سا کیوں ہے

یہ گردشیں ہیں، تو جینے کا ڈھب بدلنا ہے
ہمیں بھی سلسلۂ روز و شب بدلنا ہے

قدم بھی رکھنا نہیں ہے، حدود سے باہر
اور اپنی منزل و راہِ طلب بدلنا ہے

یہ لگ رہا ہے، وہی بات ہونے والی ہے
مرے نصیب کو، جس کے سبب بدلنا ہے

وہ وقت آ ہی گیا ہے، کہ فیصلہ کر لیں
اگر بدلنا ہے رستہ تو اب بدلنا ہے

تو ہم ہی، ایک سی حالت پہ کیسے قائم ہیں
اگر نظام ہے ایسا، کہ سب بدلنا ہے

بلندیوں کا سہانا سراب تھے ہم لوگ
پتہ چلا، کہ سرِ موجِ آب تھے ہم لوگ

کھلی جب آنکھ، تو منظر، وہی پرانا تھا
تو اس فریب میں بھی، کیا محوِ خواب تھے ہم لوگ

تمام عمر یہی سوچتے ہوئے گزری
وہ کیا سوال تھا، جسکا جواب تھے ہم لوگ

رفاقتوں کا بھی موسم بدلتا رہتا ہے
خود اپنے آپ پہ اکثر عذاب تھے ہم لوگ

ورق الٹتے رہے سب، پڑھا کسی نے نہیں
یہ کس زبان میں لکھی کتاب تھے ہم لوگ

نہ اپنے آپ کو سمجھے، نہ دوسروں پہ کھلے
کہ سر سے پیر تلک اک نقاب تھے ہم لوگ

ادھر سے اک سنہرا سا غبار، اب تک نہیں آیا
مرے صحرا میں، وہ ناقہ سوار، اب تک نہیں آیا

پرانی دوستی تھی، سرپھری موجوں سے اس کی
تو وہ تیراک، کیوں دریا کے پار، اب تک نہیں آیا

ہمیں کچھ اور بھی، اس کے علاوہ چاہیے شاید
کہ وہ بھی آ گیا، لیکن قرار، اب تک نہیں آیا

سفر میں پھول سے ملے، نشے میں چور سے لمحے
کہیں ملتے ہیں، لیکن وہ دیار، اب تک نہیں آیا

رگوں میں اب لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں باقی
مگر ان زرد پھولوں پر نکھار، اب تک نہیں آیا

مٹی مٹی سی سہی، کچھ نشانیاں تو ہیں
ہمارے بعد، ہماری کہانیاں تو ہیں

تعلقات پہ یہ وقت ہے کڑا کہ اسے
شکایتیں نہ سہی، بدگمانیاں تو ہیں

ہمارے چہرے بھی، دل کی عجب کتابیں ہیں
لکھا نہیں ہے، مگر ترجمانیاں تو ہیں

نکل کے کچھ تو ملا، بام و در کی سرحد سے
مکاں نہیں ہے، مگر لامکانیاں تو ہیں

نہیں ہے حرف و نوا سے، اگر کوئی نسبت
بیان کرتی ہوئی، بے زبانیاں تو ہیں

رات ٹھنڈی ریت نے جادو کیا
خون کی موجوں کو بے قابو کیا

دل کو پراسرار جنگل کر دیا
اور اک پرچھائیں کو آہو کیا

اس نے بھیجے پھول، لفظوں کے مجھے
اور اک اک حرف کو خوشبو کیا

آسماں تک حوصلہ پرواز کا
بال و پر نے کس طرح قابو کیا

کیوں کیا، یہ اہتمامِ رنگ و بو
اور آنکھوں کو، نظارہ جو کیا

کس لئے، آواز کو ہجر ملی
کس لئے آباد، ملکِ ہو کیا

جب رہائی کی کوئی صورت نہ تھی
کیوں گرفتارِ قد و گیسو کیا

اب تعلق کو یہ معراج بھی حاصل ہو جائے
ایک نام اور ترے نام میں شامل ہو جائے

میں کہاں اپنی وفاؤں کا صلہ مانگتا ہوں
کم سے کم میری صداقت کا تو قائل ہو جائے

اس قدر زور ہوا کا ہے کہ میں ڈرتا ہوں
ریت برسات کے پانی میں نہ شامل ہو جائے

اور یوں ہو، کہ اٹھیں ہاتھ دعا کو جب بھی
مجھ پہ ہر حرف ترے نام کا نازل ہو جائے

دستِ کمال، حرفِ دعا بھی نہیں رہا
ایسے لٹے کہ گھر کا پتہ بھی نہیں رہا

کیا چاہتی ہے اور گھنے جنگلوں کی آگ
اب تو کوئی درخت ہرا بھی نہیں رہا

اس پار بستیوں سے بھی اٹھا وہی دھواں
ایسی تو آگ کوئی لگا بھی نہیں رہا

جلتے ہوئے چراغ کے دم سے تھیں برکتیں
بجھنے لگا تو زورِ ہوا بھی نہیں رہا

ایسی ہوا چلی ہے نئے موسموں کے ساتھ
فرقِ سموم و بادِ صبا بھی نہیں رہا

ابھی یہ کھیل تلاطم بہت دکھائیگا
کبھی ڈبوئے گا مجھکو، کبھی بچائیگا

طلسم کوہِ ندا، جب بھی ٹوٹ جائے گا
تو کاروانِ صدا بھی، پلٹ کے آئیگا

کھنچی رہینگی سروں پر اگر یہ تلواریں
متاعِ زیست کا احساس بڑھتا جائیگا

یونہی ڈبوتا رہا، کشتیاں اگر سیلاب
تو سطحِ آب پہ، چلنا تجھی آ ہی جائے گا

کواڑ اپنے ، اسی ڈر سے کھولتے ہی نہیں
سوا ہوا کے انھیں کون کھٹکھٹائے گا

میں اپنے قتل پہ چیخوں، تو دور دور تلک
سکوتِ دشت میں، اک ارتعاش آئیگا!

ہوائیں لیکے اڑیں گی تو، برگِ شجر زدہ
نشان، کتنے نئے راستوں کا پائے گا

چڑھا ہوا ہے جو سورج، غروب بھی ہوگا
کڑی ہے دھوپ، تو ابرِ رواں بھی آئیگا

ہمیں پہ ختم ہے مسدود راستوں کا سفر
ہمارے بعد کوئی قافلہ نہ جائے گا

راستہ سمندر کا، جب رکا ہوا پایا
اور بچے کناروں کو کاٹتا ہوا پایا

دیر تک ہنسا تھا میں، دوستوں کی محفل میں
لوٹ کر نہ جانے کیوں، دل دکھا ہوا پایا

میرے واسطے شاید، خط میں تھا وہی جملہ
تیز روشنائی سے جو کٹا ہوا پایا

دھوپ نے ٹٹولا جب منجمد چٹانوں کو
برف کے تلے لاوا کھولتا ہوا پایا

نیند کی پری سے آخر، ہو گئی خفا ہم سے
اور کوئی آنکھوں میں جب چھپا ہوا پایا

سوچیے! کہیں گے کیا؟ لوگ ایسے موسم کو
جس میں سبز شاخوں کو سوکھتا ہوا پایا

مسلسل اب سفر کرنا پڑے گا
یہ رستہ معتبر کرنا پڑے گا

اسی کی سمت ہوگا وار لیکن
مجھے سینہ سپر کرنا پڑے گا

طبیعت اس پہ آمادہ نہیں ہے
یہ سمجھوتہ مگر کرنا پڑے گا

دعائیں حرف و لب کی قید میں ہیں
کوئی ربطِ دگر کرنا پڑے گا

کوئی سنتا نہیں آواز ایسے
ہمیں کچھ شور و شر کرنا پڑے گا

زمیں کی پیاس کو یا جان و تن کو
لہو سے کس کو تر کرنا پڑے گا

کرتے رہے، ہم ایسے ستمگر کی آرزو
آنکھوں سے جس نے چھین لی منظر کی آرزو

باہر کی رونقیں بھی، بلاتی رہی ہمیں
دامن کو کھینچتی بھی رہی، گھر کی آرزو

کاغذ کی کشتیوں میں، سفر پے نکل پڑے
تھی کس قدر شدید سمندر کی آرزو

کھلنے کی کشمکش میں، الجھتے چلے گئے
دیوار بن گئی ہے، ہمیں در کی آرزو

جب ہوا دا، تو جان سی پڑ جائے حرف میں
اس کے سوائے کیا ہے سخنور کی آرزو

پایاب پانیوں کے سفر سے بھی ڈر گئے
مہنگی پڑی ہے اتنی سمندر کی آرزو

سینۂ خواب میں، سورج کے جو نشتر اترے
خون میں ڈوبے ہوئے، صبح کے منظر اترے

دل میں بیتاب تمناؤں کے چشمے پھوٹے
آنکھ میں، ہاری ہوئی فوج کے لشکر اترے

تیز پانی کے مسافر ہیں، ہمیں کیا معلوم
کس کی منزل ہے کہاں؟ کون کہاں پر اترے

پار جانے کا، کوئی اور طریقہ ہی نہ تھا
چڑھتے دریا میں، بہت سوچ سمجھ کر اترے

اپنے ورثے کی صداقت کا بھرم رکھنا تھا
ہم ہی، ہر جلتی ہوئی آگ کے اندر اترے

دور ہی دور سے، کترا کے نکل جاتا ہے
کوئی موسم، کوئی بادل تو مرے گھر اترے

چاندنی راتوں میں ہم نے بھی بہت چاہا تھا
کشتیِ ماہ سے اک نور کا پیکر اترے

دلوں کی ساری کدورت کو صاف کرنے کو
وہ آئے گا، میرا سینہ شگاف کرنے کو

یہ راستہ، تو اسی شہر کو پلٹ آیا
ادھر تو آئے تھے ہم، انحراف کرنے کو

گناہ کس کا تھا، لیکن تری عدالت میں
مجھی کو جانا پڑا، اعتراف کرنے کو

اٹھے وہ آنکھ، تو کھل جائیں بند دروازے
کھلیں وہ لب، تو کوئی انکشاف کرنے کو

اگر حساب میں کچھ اور ماجرا نکلا
تو کون کس سے کہے گا معاف کرنے کو

رنجِ احساس کو، الفاظ میں ڈھل جانے دے
کھولتے لاوے کو، سینے سے نکل جانے دے

سرد مہری، کہیں موسم کا تقاضہ ہی نہ ہو
دیکھنا اس کو، ذرا برف پگھل جانے دے

کیا مجھے ٹھوکریں کھانے میں مزا آتا ہے
میں سنبھل جاؤں اگر کوئی سنبھل جانے دے

اوڑھ لی رات نے تاروں کی چمکتی چادر
اب مرے گھر میں چراغوں کو بھی جل جانے دے

عجیب رونق سی، گھاؤ پر تھی
کہ جیسے، مہندی رچاؤ پر تھی

کھلاڑیوں کو، پتہ نہیں تھا
وہ چیز کیا تھی، جو داؤ پر تھی

اُدھر نہ جانے دیا کسی نے
جدھر طبیعت جھکاؤ پر تھی

مکان ہی رستے میں آ گیا تھا
ندی تو اپنے بہاؤ پر تھی

ابھی سے کیوں لوگ اٹھ رہے ہیں؟
ابھی تو محفل جماؤ پر تھی

نہ کوئی پیاسا تھا پنگھٹوں پر
نہ بھیڑ باقی الاؤ پر تھی

جذبۂ شوق کو اعجاز بیانی دینا
بند پانی کے ذخیرے کو، روانی دینا

سالہا سال کی، لکھی ہوئی تحریروں میں
اس سے پہلے کہ مٹے، کچھ تو معانی دینا

ریگِ ساحل پہ، ہر اک موج نے، یہ لکھا ہے
ہم بھی پیاسے ہیں، کوئی ہمکو بھی پانی دینا

بھول جائیں نہ کہیں لوگ وفا کے قصے
تم بھی اس دور کو اک تازہ کہانی دینا

سرخ پھولوں کی قطاریں ہوں کہ جلتے ہوئے دیپ
کچھ تو اس راہ کو تم اپنی نشانی دینا

دوری میں بھی، قربت کا احساس رہے
وہ تو ہر صورت میں میرے پاس رہے

جس مٹی کو، سرخ لہو سے سینچا ہے
اس مٹی کو، ہریالی کی آس رہے

بارش بس، ندیوں کو جل تھل کرتی ہے
تپتے صحراؤں میں اب بھی پیاس رہے

برفیلے موسم کی تیز ہواؤں کو
کس کس کی عریانی کا احساس رہے

وہ بھی تھے انجان مکانوں کے جنگل
شہروں میں بھی جیسے ہم بن باس رہے

چھوتے ہی اس کے جسم کا سونا پگھل گیا
وہ پھول سا بدن ہے مگر ہاتھ جل گیا

جیسے کسی عظیم مصور کا شاہکار
یا اک حسین خواب، حقیقت میں ڈھل گیا

کیا بات ہے کہ اک ذرا لہجے کے فرق سے
الفاظ تو وہی ہیں پہ مطلب بدل گیا

خوش رنگ ساعتوں کے پرندوں کی ٹولیاں
جھونکا ہوا کا لے کے کدھر کو نکل گیا

بڑھتے ہوئے قدم کو مسافت عزیز ہے
دیوار سنگ توڑ کے دریا نکل گیا

رات خواب دیکھا تھا، تیز بھاگتے ہیں ہم
صبح سے کھڑے ہیں اب، پھر بھی ہانپتے ہیں ہم

بوند بوند جلتے ہیں، آرزو کے صحرا میں
موم کا بدن لے کر، دھوپ تاپتے ہیں ہم

نیند کے جزیروں تک، ناؤ اب نہیں جاتی
رات کا سمندر ہے، اور جاگتے ہیں ہم

آج دل کی وادی پر برف جم گئی ایسی
سر پہ، گرم سورج ہے، پھر بھی کانپتے ہیں ہم

سائباں نہیں کوئی، اب اماں نہیں کوئی
اور تیز بارش ہے جلتا بھاگتے ہیں ہم

دل کی آواز پر بھی، دھیان لگا
کوئی کچھ کہہ رہا ہے، کان لگا

آ جبیں پر مری، نشان لگا
داؤ پر، تیر اور کمان لگا

تیرتا پھر، کھلی فضاؤں میں
دست و بازو میں بادبان لگا

اپنے اپنے، حصار میں رہنا
پھر، باہر ہوئے کہ بان لگا

ٹوٹتی جا رہی تھیں، سب سمتیں
ہر طرف مجھکو آسمان لگا

کوئی منزل ہو راہ ایک سی ہے
چہرہ چہرہ لہولہان لگا

کاٹتے بھی ہیں اسی فصل کو بونے والے
ڈوب بھی جاتے ہیں اک روز ڈبونے والے

لاش ابھری تو کئی نام لکھے تھے اس پر
کتنے حیران ہوئے مجھکو ڈبونے والے

کچھ تو اس سادہ مزاجی کا صلہ دے ان کو
کس قدر جلد بہل جاتے ہیں رونے والے

زندگی لاکھ انہیں بارِ گراں لگتی ہے
خوش تو رہتے ہیں مگر بوجھ یہ ڈھونے والے

داغ مٹ جائیں مگر میرے لہو کی خوشبو
تیرے دامن سے کہاں جائیگی دھونے والے

وقت آواز یہ آواز دیے جاتا ہے
اور سوتے ہی چلے جاتے ہیں سونے والے

دھواں بڑھے گا، چراغوں سے نور کم ہوگا
کسے خبر تھی، کہ یہ حال صبح دم ہوگا

شگفتنِ گل، حرف صدا کا موسم ہے
اب اور نطق کی شاخوں کا سر قلم ہوگا

رفیق، شہر ملامت میں، کون ہوتا ہے
اگر ہوا بھی، تو بس ایک دو قدم ہوگا

ہو جلے گا چراغوں میں کتنی دیر کے بعد
شکست کب یہ طلسمِ شبِ الم ہوگا

کبھی تو لفظ چلیں گے مرے اشارے پر
کبھی تو لوح بھی میری، مرا قلم ہوگا

شہر خوش فہمی کا جب سے بند دروازہ ہوا
قدر و قیمت کا نہیں تب اپنے اندازہ ہوا

بھولنا تو چاہتے رہتے تھے ہم اس بات کو
ہر بہانے سے مگر وہ واقعہ تازہ ہوا

ان ہواؤں کو مگر حاصل تو کچھ ہوتا نہیں
منتشر پہلے بھی اکثر میرا شیرازہ ہوا

آنکھ میں ٹھہرے ہوئے پانی کو کچھ سمجھے نہ تھے
جب اسی سیلاب میں ڈوبے تو اندازہ ہوا

کچھ سمجھ کر ہی بہایا تھا مگر میرا لہو
رنگ ہی لایا نہ عارض کا ترے غازہ ہوا

اشک ہیں چشم انتظار میں گم
اک سمندر ہے رہگزار میں گم

کون مانے گا اس حقیقت کو
پھول اور موسم بہار میں گم

جس سے اپنا پتہ ملا مجھکو
ہو گئے ہیں اسی دیار میں گم

ڈھونڈنے والے ڈھونڈ سکتے ہیں
منزلیں ہیں اسی غبار میں گم

خاک اڑائی تھی کارواں نے بہت
ہو گیا آخرش غبار میں گم

کیسے کہیں حیات خطا کار بھی نہ تھی
جتنی سزا ہے، اتنی گنہگار بھی نہ تھی

پتھراؤ کرتے رہنے کی بس رسم پڑ گئی
وہ شاخ یوں تو اتنی ثمردار بھی نہ تھی

آنکھوں میں کاٹنا تھی اسے بھی تمام شب
حصّے میں جس کے، دولت بیدار بھی نہ تھی

بادِ شمال برف کے پیغام لاتی تھی
اور دھوپ تھی کہ سننے کو تیار بھی نہ تھی

اک دوسرے سے وہ بھی شناسا نہ ہو سکے
جن کے گھروں کے بیچ میں دیوار بھی نہ تھی

عمر بھر جو رہا اجنبی کی طرح
چاہتے تھے اسے زندگی کی طرح

دوستی کی تو تم سے توقع نہ تھی
دشمنی بھی نہ کی دشمنی کی طرح

حاصلِ عشق صرف ایک لمحہ سہی
ایک لمحہ بھی ہے اک صدی کی طرح

نیند میں کیوں نہ ڈوبی ہوں بیدار یاں
زندگی بھی تو ہے خواب ہی کی طرح

جب تری زلف کی چھاؤں میں آ گئی
دھوپ بھی ہو گئی چاندنی کی طرح

دشت میں رہ کر، چمن کی گفتگو کرتے رہے
کس قدر دیوانہ پن کی گفتگو کرتے رہے

دیکھ کر صحرا میں پھولوں کو بہت جی خوش ہوا
دیر تک ہم باغ و بن کی گفتگو کرتے رہے

تھا بیاں ایسا کہ لفظوں سے لہو بہنے لگا
جانے کس کے بانکپن کی گفتگو کرتے رہے

تھا کمالِ رنگ و بو کیف و طرب کا تذکرہ
اور سب اس کے بدن کی گفتگو کرتے رہے

ایک ہم ہی تھے کہ جو عریانیوں کے شہر میں
احترامِ پیرہن کی گفتگو کرتے رہے

اس کا تو ہر انداز، نرالا سا لگے ہے
قاتل ہے مرا، اور مسیحا سا لگے ہے

وہ جس سے کوئی خاص، تعارف بھی نہیں ہے
جب بھی نظر آجائے ہے، اپنا سا لگے ہے

ہم اس کے بنا، جیسے مکمل ہی نہیں ہیں؟
جو کام بھی کرتے ہیں، ادھورا سا لگے ہے

میں اس کی، ہر اک بات کو، کس طرح نہ مانوں
وہ جھوٹ بھی بولے ہے، تو سچا سا لگے ہے

اک عمر ہوئی، ٹوٹے ہوئے دل کو ہمارے
یہ زخم مگر آج بھی کل کا سا لگے ہے

اتنی سی خطا پر، کہ ترا نام لیا تھا
ہر شخص، مرے خون کا پیاسا سا لگے ہے

۱

یہ مری سادہ دلی ہے، کہ مرا حسنِ یقیں
نا امیدی میں بھی، اک آس بندھی رہتی ہے

جانتا ہوں، کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا
جانے دروازے پہ، کیوں آنکھ لگی رہتی ہے

۲

سلسلہ، ٹوٹنے نہیں پاتا
آج کی بات، کل پہ ٹلتی ہے

شمعِ امید بھی عجب شے ہے
روز بجھتی ہے روز جلتی ہے

۳

بڑے مہیب ہیں بادل، بڑی شدید ہوا
ہر ایک سمت ہے، طوفان سر اٹھائے ہوئے

یہ سوچتا ہوں کہ جب ناخدا بھی ساتھ نہیں
تو کون ہے؟ جو ہے کشتی مری بچائے ہوئے

۴

کچھ خفا سا ہی سہی، پر وہ ہمارا تو ہے
سن ہی لے، ٹوٹے ہوئے دل سے پکارا تو ہے

کیا پتہ، ساحلِ امید سے لگ ہی جائیں؟
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا تو ہے

۵

زندگی کی اداس راہوں میں!
ایسے تیرا خیال آتا ہے

جیسے شامِ الم کی ظلمت میں
اک ستارا سا جگمگاتا ہے

۶

تم کو پانے کی ہوس ایک حسیں خواب سہی
ایسے خوابوں کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے

جیسے راہوں میں کہیں گھرے اندھیروں کے قریب
ایک تابندہ ستارا بھی بہت ہوتا ہے

۷

زندگی جتنی دکھی ہے، وہ ہمیں جانتے ہیں
چوٹ کس درجہ کڑی ہے، وہ ہمیں جانتے ہیں

یوں تو ہم ہنس بھی دیے ہیں، تری خاطر لیکن
دل میں جو چیخ گھٹی ہے، وہ ہمیں جانتے ہیں

۸

زندگی میں، ہر ایک غم کے بعد
شادمانی، نصیب ہوتی ہے

جتنی تاریکی، بڑھتی جاتی ہے
صبح، اتنی قریب ہوتی ہے

۹

چند بجھتے ہوئے چراغ یہاں
دور ہر چیز جگمگائی ہے

مجھ سے یہ فیصلہ نہیں ہوتا
شام گزری کہ شام آئی ہے

۱۰

کتنی شاداب و جواں کتنی حسیں ہے دنیا
پھول کی، رنگ کی، خوشبو کی زمیں ہے دنیا

جام و صہبا کا جہاں، نغمہ و گل کی وادی
یہ تو سب کچھ، مگر میری نہیں ہے دنیا